ڈاکٹر راحیلہ لطیف

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، قصور

سفر وجود کی داستان بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی زبانی

Dr. Rahila Latif

Lecturer Urdu Department, Govt. Degree College, Kasoor.

"Safar e Wujood ki Dastan, Ashfaq Ahmad or Bano Qudsia ki Zubani"

This article deals with the discussion of *being* as discussed in the novels of Ashfaq Ahmad and Bano Qudsia. Sufiism gives an insight into the ontological quest of the human soul. Ashfaq Ahmad and Bano Qudsia have so much to refer to this quest in their work which in a way reveals the journey of discovering the self. Here we have discussed the novels of the two writers in order to experience their perspectives on self-realization.

اصول یہ ہے کہ عہدہ جتنا بڑا ہو ذمہ داری بھی اتنی بڑی ہوتی ہے اور حضرتِ انسان کے عہدے اور ذمہ داری کا کیا کہیے کہ موصوف اُس بار کو اٹھالایا جس نے سب پہ گرانی کی۔ اشرف المخلوقات کا تاج سر پہ سجا کر تسخیرِ کائنات کے جوہر سے متصف انسان جب اپنے عہدے اور جوہر سے منحرف ہوتا ہے تو اسفل السافلین قرار پاتا ہے اور ذمہ داری کو نبھانے والا حقیقتِ قصویٰ کہ قرب اور نیابتِ الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے۔ اِن دو انتہاؤں میں انتخاب کا اختیار اسے دیا گیا ہے۔ انھی دو انتہاؤں کا نہایت منفرد تجزیہ ہمیں بانو قدسیہ کے معروف ناول "راجہ گدھ" میں ملتا ہے جہاں ان انتہاؤں کو مثبت اور منفی دیوانے پن سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان وجوہات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے جن کی بنا پر وجودِ انسانی یا تو نہایت مقدس ہو کر ارفعیت کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے یا اپنی حقیقت فراموش کر کے بہیمیت پر اتر آتا ہے۔

ناول کے آغاز ہی میں ایم اے کی تعارفی کلاس سے مخاطب ڈاکٹر سہیل ایسے گرو کے طور پر سامنے آتے ہیں جو اپنے چیلوں کو وجود کے ادق مباحث کی طرف نہایت عام فہم انداز سے متوجہ کر کے ان کے جوہرِ وجود کو صیقل کرنے کا ملکہ رکھتا ہے، انھیں روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی ترغیب دیتا ہے اور پاگل پن کی کوئی حیران کن انوکھی وجہ دریافت کرنے کے

لیے کہتا ہے، اسی تعارفی کلاس میں ہم سیمی، آفتاب اور قیوم کے اہم کرداروں سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ دوسری وجوہات جو عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اُن سے ہٹ کر آفتاب مقدس دیوانگی کی طرف توجہ دلاتا ہے جو انسان کو تسخیرِ کائنات پر اکساتی ہے:

"مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔۔۔اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔ صرف ایک وجہ عشقِ لاحاصل۔۔۔"(۱)

اسی نشست کے دوران ایک انجانی قوت کے تحت آفتاب بٹ کے عشقِ لاحاصل کے مقدس دیوانے پن کا شکار ہونے والی سیمی شاہ دورِ جدید کی نمائندہ نسل سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کے جذبۂ عشق کا ارتکاز بتاتا ہے کہ عشق کا تعلق جدید یا قدیم سے نہیں بلکہ روح سے ہے جو اپنی اصل سے بچھڑی ہوئی اور اس سے ملنے کو بے قرار ہے۔ گرو ڈاکٹر سہیل کے چیلوں میں تیسرا نمائندہ کردار جس کے ہاتھ میں بیانیہ کی باگ ڈور ہے۔۔۔ قیوم کا ہے جو سیمی کے عشقِ لاحاصل کا کشتہ بنا لیکن اس کے مقدر میں دیوانگی کا تقدس نہ آیا بلکہ وہ مادے کی دلدل میں دھنس گیا۔ دیوانے پن کے اسی مبحث کو مزید واضح کرنے کے لیے بانو قدسیہ نے پرندوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں گدھ پر الزام کے حوالے سے جو علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے وہ نہایت منفرد ہونے کے ساتھ ابلاغ کے مقصد کو بھی بخوبی پورا کرتا ہے۔ وجودِ انسانی کو درپیش خطرات کی سنگینی پرندوں کے خدشات میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ گویا اشرف المخلوقات اپنے منصب کو نہ نبھا کر پوری کائنات کو کرب سے دوچار کرتا ہے۔ ہما جو خلافت کے وعدے کی مکرر خلاف ورزی کے باعث حضرتِ انسان سے بددل ہو کر روپوش ہو گیا ہے، اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا لہٰذا کانفرنس کی صدارت کے لیے راہب پرندے سیمرغ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو جنگل میں ایک "چودہ سو سال" پرانے بڑ کے درخت تلے متمکن ہوتا ہے۔ یہ ایک بلیغ اشارہ ہے جو چودہ سال قبل آنے والے انسانیت کے اجتماعی وجود کی علویت کے پیغام سے بے خبری پر نوحہ کناں ہے۔ یہ کانفرنس پہلی مرتبہ تب بلائی گئی جب ایٹم بم بنا کر متمدن ہونے والے انسان نے ابھی اپنی ہی بستیوں کو ویران نہیں کیا تھا اور پرندے انسان کی اس دیوانگی کے سبب تشویش میں مبتلا تھے کہ وہ ایجاد کی اپنی فطری صلاحیت کو منفی طور استعمال کر رہا ہے۔ پرندوں کے بادشاہ کے حضور چیل برادری کی طرف سے یہ مقدمہ پیش کیا گیا تھا کہ انسانوں کے زیرِ اثر گدھ جاتی میں بھی دیوانگی کے اثرات ملاحظہ کیے گئے ہیں جو پرندوں کے لیے نقصان کا باعث ہو سکتے ہیں کیوں کہ یہ چاندنی راتوں میں مرغزاروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ ان کی حرص کا یہ عالم ہے کہ پیٹ بھر کر کھاتے، قے کرتے اور پھر کھاتے ہیں۔ گدھ جاتی کے متعلق الزام سننے کے بعد سیمرغ بھی ڈاکٹر سہیل کی مانند یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اس دیوانے پن کی وجہ معلوم کی جائے، دوسرے یہ کہ کیا ان کا دیوانہ پن واقعی جنگل کی باقی آبادی کے لیے خطرہ ہے اور اگر دیوانہ پن ان کی سرشت میں داخل ہے تو ان کے خلاف تادیبی کاروائی کرنا خالق اور مخلوق کے درمیان

حائل ہونا ہے۔ اعترافِ جرم کرنے والا گدھ بھی اپنی دیوانگی کے راز سے واقف نہیں۔ نجد کی رہنے والی ایک بلبل گدھ کی دیوانگی کا تعلق انسان کی دیوانگی سے جوڑتے ہوئے انسان کی دیوانگی کا راز جنس کی طاقت کے مشکی گھوڑے کو بتلاتی ہے جو انسان کو دین و دنیا کی مسافتیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے، اس گھوڑے پر اگر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے اور ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا اور پاگل کہلاتا ہے۔ آفتاب کی طرح یہ بلبل جس کے گلے میں حدی خوانوں کے نغمے اور سینے میں انسان کے عشق کا خون جما ہوا تھا، دیوانگی کی وجہ عشقِ لا حاصل کو بتلاتی ہے۔ راجہ گدھ میں اس عشقِ لاحاصل کی تجسیم سیمی اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود روح کے آزار سے مغلوب ہو کر قدم قدم بہت آگے نکل جاتی ہے۔ آفتاب اُسے کوئی وجہ بتائے بغیر اُس کی شدید محبت کو تیاگ کر اپنی کزن سے شادی کر کے لندن چلا جاتا ہے۔ سیمی کی شوریدہ سری اس حد تک بڑھتی ہے کہ آفتاب کے ساتھ پیش آنے والے تمام معمولات کا اُسے پہلے ہی سے علم ہو جاتا ہے۔ اُس کا خارجی وجود اُس کے لیے بے معنی اور باطنی وجود آفتاب میں فنا ہو چکا ہے۔ اور وہ دیدۂ دل وا کیے اُن تمام مناظر سے لذت بھری اذیت کشید کرتی ہے جو آفتاب کے معمولات کا حصہ ہیں۔ آفتاب کے عشقِ لاحاصل میں فنا ہوا اُس کا وجود اسے اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کرنے دیتا کہ قیوم بھی ایسی ہی بے کسی سے اُس کے عشقِ لاحاصل میں گرفتار ہے کہ راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق؟؟؟

آفتاب سیمی کے جذبے کی شدت سے آگاہ ہے لیکن وہ تقدیر کی جبریت کا قائل ہے اور مختاری کی تہمت قبول کرنے سے گریزاں ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ فیصلے انسان کی سرشت میں داخل کر دیے جاتے ہیں، وہ اپنی اس سوچ کو اپنے گرو ڈاکٹر سہیل کی صحبت کا فیضان قرار دیتا ہے کہ زندگی سے متعلق راضی برضا ہو جانے کا رویہ انھی کی عطا تھا کیوں کہ اپنی مرضی پر ڈٹے رہنے والے لوگ مشیت کی خلاف ورزی کر کے نظامِ فطرت میں رخنہ اندازی کا سبب بنتے ہیں اور سیمی کی طرح اپنے وجود کو بھی ریزہ ریزہ کر لیتے ہیں۔ یہ آفتاب اور سیمی کے نظرے ۂ محبت کا فرق تھا، اس دو طرفہ محبت کو آفتاب کسی دائرے کا اسیر نہیں کرنا چاہتا تھا جب کہ سیمی کو آفتاب کے بعد کوئی دوسرا نظر ہی نہ آیا۔ آفتاب میں فنا ہو کر وہ بے نیازِ دو جہاں ہو گئی اور قیوم مرتی ہوئی سیمی کے لاشے کو خوشبو سونگھتا اُس تک جا پہنچا۔ راجہ گدھ نے مردار کو ہڈیوں تک صاف کر ڈالا اور روح کو سونپ چکنے کے بعد سیمی کو جسم کی پروا بھی نہ ہوئی کیوں کہ جب اُس کی ضرورت آفتاب کو نہ تھی تو وہ کوڑے کا ڈھیر تھا جس پر کوئی بھی غلاظت پھینک سکتا تھا۔ اس نے گویا ملامتیہ فرقے میں شامل ہو کر اپنا جسم قیوم کے حوالے کر دیا لیکن قیوم کی محبت اور جسمانی وارفتگی اُس کے وجود کی پراگندگی کو دھو نہ سکی اور اُن کے درمیان بُعد برقرار رہا۔ لارنس باغ میں اس واقعے کا "کافور" کے درخت تلے پیش آنا اور مشعلیں جلائے، گنجے سر، نوگزے جنات کا موجود ہونا سیمی کی مردنی کے تاثر کو تقویت دیتا ہے۔ قیوم اور سیمی کا عشقِ لاحاصل، ذات کی نفی اور تذلیل انھیں وجودی کردار بناتا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ مجھے اپنی شکل، عقل، عادات، گھرانے اپنے مکمل وجود سے نفرت ہے۔۔۔ مجھ میں اگر کچھ بھی اچھا ہوتا تو کیا آفتاب مجھے چھوڑ کر جاتا؟"(۲)

یہاں تک کہ جب جسم کے راستے سے قیوم سیمی کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہا تو اس نے سیمی سے ہر تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ناول نگار اس ناآسودگی کے ڈانڈے بنی قابیل کے غلبے سے ملاتی ہیں جس کے سبب جنسی محرونی، قلبی تھکن اور روحانی خلاء کے ذریعے انسانی وجود کھوکھلا ہو گیا تھا اور روحانی حرام کھانے والوں کے چہرے راجہ گدھ جیسے ہو گئے تھے اور قیوم برملا خود کو راجہ گدھ تسلیم کرتا تھا۔ سیمی سے نہ ملنے کا عہد کرنے کے بعد وہ تلاوت الوجود میں مبتلا ہو گیا اور اس اندرونی ہیجان میں اُسے اپنے اور اپنے اقربا کے چہرے گدھ برادری جیسے معلوم ہوتے۔ یہ لوگ ضلع شیخوپورہ کے گاؤں چندرا کے رہنے والے تھے اور یہ وہی علاقہ تھا جہاں جانوروں کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ قیوم اور اُس کے بڑے بھائی مختار اپنی والدہ کی وفات کے بعد کبھی گاؤں نہ لوٹے تھے۔ مرض الموت میں مبتلا اُس کی والدہ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ بلھے شاہ کی نگری میں اپنے بھائی کے گھر رہتی اور اُس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں کہ ایک روز موسم کی کسی انجانی کیفیت کے بہاؤ میں وہ مزار تک گئیں اور وہاں پہ بیٹھے قیوم کے باپ کے ساتھ اس کے گاؤں چلی آئیں، اس کے بعد اُس کا اپنے میکے کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا، ماں کی وفات کے بعد قیوم اپنے ماموں کے ہاں مقیم رہا، اب اُن کا گاؤں کلر کی زد میں آچکا تھا اور اس کے پیچھے عزیز گاتن کی ماں کی بددعا تھی کہ جس کا بیٹا گاؤں والوں کی بدسلوکی کے سبب اُسے چھوڑ گیا تھا اور پھر اُس بیٹے کی خاطر جائز ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرنے والی یہ ماں بھی غائب ہو چکی تھی۔

قیوم کا باپ اپنی مردہ بیوی کے تصور کو سینے سے لگائے ڈھنڈار حویلی میں اُس سے باتیں کرتا پھرتا تھا، اور وہ اسے راجہ گدھ لگتا جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور کو سینے سے لگائے پھرتا تھا، سیمی سے نہ ملنے کے عہد کے بعد ایک مرتبہ سرِ راہے ریڈیو سٹیشن میں اُس سے ملاقات ہوتی ہے تو دوسری مرتبہ تب جب سیمی ہسپتال کے بستر پہ تھی اور اُس نے زار و قطار روتے ہوئے قیوم کو بتایا تھا کہ اُس سے محبت کرنا اُس کے بس میں نہ تھا اور پھر موت سے بہت پہلے مر جانے والی عشقِ لاحاصل کی دیوانی کو موت لے گئی، عشقِ لاحاصل کا نتیجہ خودکشی کی صورت میں نکلا تھا اور قیوم نے:

"۔۔۔۔۔۔ محبت کا سارا وبائی مادہ اپنے اندر جذب کر لیا۔ اب پاگل پن کا وبا کی صورت میں پھیلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کرگس جاتی کو یہی حکم ہے کہ وہ عشقِ لاحاصل کے تعفن کو عام نہ ہونے دے۔"(۳)

وجودِ انسانی کے دیوانے پن کی وجہ تلاش کرتے ہوئے بیانیہ "شام سے عشقِ لاحاصل" کا تجزیہ کرنے کے بعد "دن ڈھلے لامتناہی تجسس" کے امکانات میں پاگل پن کا جواز تلاش کرتا ہے، ناول کے دوسرے حصے کا آغاز کئی برسوں

کے بعد گدھ جاتی کی دوسری پیشی سے ہوتا ہے۔ اس بار کانفرنس کا انعقاد پوٹھوہاری علاقے کے بجائے اس جگہ ہوا جہاں بعد میں شیخوپورہ علاقے کا گاؤں چندرا آباد ہوا۔ (یہاں اس علامتی تسلسل کی خوبصورتی واضح ہوتی ہے کہ قیوم جس کے لیے راجہ گدھ کی علامت استعمال ہوئی ہے اسی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے)۔ اس مرتبہ گدھ برادری نے اپنے راجہ سے کسی وکیل کی تلاش کا مطالبہ کیا۔ اس برادری میں نجاشی بادشاہ کا عہد خواب میں دیکھنے والی گدھ کی موجودگی اُس وقت کی یاد دلاتی ہے جب اجتماعی وجود کی ترقی کے انسانیت دوست مشن کی خاطر اللہ کے پیاروں نے ہجرت کی تھی لیکن ان کی وراثت کے دعوے دار اُن کے ایثار اور عجز کو تج کر حرص اور تکبر کا شکار ہوئے۔ اس علامتی پیرائے میں بانو قدسیہ نہایت بلاغت سے اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہتی ہیں کہ آج اسفل السافلین کی پستی میں جا گرنے کی بنیادی وجہ اپنی جڑوں سے دوری ہے۔ جب یمن کا گدھ ہجرت کا مشورہ دیتا ہے تو راجہ گدھ کی علامت کی دوہری سطح آشکار ہوتی ہے، اگر ایک سطح پہ مردار کھانے اور حرص و ہوس میں مبتلا ہونے کا منفی رویہ ہے تو دوسری سطح پہ مان لینے اور صلح جوئی کا مثبت رویہ بھی ہے۔ گدھوں کی باہمی گفتگو میں انسانیت کے آنے والے نجات دہندہ کا متعدد بار ذکر ملتا ہے جو وجدان کے بل پر انسانیت اور تمام ذی روحوں کو ہجرت، امن اور محبت کا اصول سکھائے گا لیکن نوجوان گدھ انتظار اور ہجرت کے حق میں نہیں اور وہ خود کو حق بجانب سمجھتے ہوئے اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے وکیل کی تلاش پہ مصر رہتے ہیں تو راجہ گدھ اکنافِ عالم میں اپنے لیے وکیل تلاش کرتا ہے لیکن کوئی بھی اکثریت کی مخالفت مول لینے کو تیار نہیں۔ بالآخر گیدڑ جو خود شیر کا چھوڑا ہوا شکار کھا کر دیوانگی کا شکار ہو جایا کرتا ہے، وکالت کے لیے تیار ہوا، ایک دیوانے کی وکالت کے لیے ایک دیوانے کا انتخاب بھی نہایت فکر انگیز نکتہ ہے۔

دوسری جانب سیمی کی موت کے بعد قیوم بھی عشقِ لاحاصل سے لامتناہی تجسس کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے کیوں کہ وہ سیمی سے مل کر اُس کی موت کی وجہ جاننا چاہتا ہے، روح کے ہونے کا ادراک چاہتا ہے اور ان سوالات میں گھرا ہوا ہے جو ہر وجود کی شکست و ریخت کا لازمی نتیجہ ہیں:

"میں کون ہوں؟
کہاں سے آیا ہوں؟
مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے؟

اور اگر مجھے کہیں نہیں جانا اور اس مٹی میں نائٹروجن کی بھاری مقدار بن کر واپس لوٹنا ہے تو پھر یہ ساری تگ و دو کیوں؟ یہ سارا عذاب کس لیے؟ کائنات کیا ہے؟

اس کائنات سے پرے کون چھپا بیٹھا ہے؟
کیا کائنات والے سے ہمارے بے حقیقت ذرات کا
کوئی تعلق ہے؟
کیا اس نے ہمیں صرف اپنی تفننِ طبع کے بنایا
ہے؟ (۴)

وجود کی اس گھٹن کو صوفیانہ اصطلاح میں قبض کہا جاتا ہے، اسی گھٹن کے دور میں ایک روز سرِ راہے اُس کی ملاقات ڈاکٹر سہیل سے ہوئی اور انھوں نے کامل گرو کی طرح معمول کی گفتگو میں اُس کی گھٹن جذب کر لی اور کسی نامعلوم طریقے پر اس کی قبض دور ہو گئی کہ ڈاکٹر سہیل کو آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف ملا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے بتائے ہوئے یوگا کی مشقوں میں مصروف قیوم کو اچانک عابدہ ملی جو اُس کی بھاوج کی عزیزہ تھی اور ایک روایتی مڈل کلاس عورت جس کے جذبات و خیالات قیوم کی ذہنی سطح سے بالکل مختلف اور معمولی نوعیت کے تھے، سیمی کے خیالات سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے قیوم راجہ یوگا کر رہا تھا۔ جب دوبارہ ڈاکٹر سہیل سے ملا تو انھوں نے تنتر ایوگا کے ذریعے شکتی حاصل کرنے کا مشورہ دیا جو بظاہر جسمانی سنجوگ ہے لیکن جوہرِ ذات پر قابو پانے کے لیے اکسیر ہے۔ واپسی پر وہ حسبِ عادت اپنی گفتگو عابدہ سے دوہراتا رہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں سمجھ سکتی اور وہ حسبِ عادت اپنی ہی پٹری پر چلتی رہی کہ اسے اپنے شوہر سے اولاد بھی نصیب نہ ہو سکی، یہی کمزوری استعمال کرتے ہوئے قیوم نے تنتر ایوگا کے سنجوگ کے لیے اسے منایا لیکن یہ تعلق بھی اسے دیوانگی کی ایک اور سمت سے زیادہ کچھ نہ دے سکا۔۔۔ عابدہ کا شوہر اسے منا کر لے گیا اور وہ بوڑھے گدھ کی مانند اونچے درخت کی آخری شاخ پر جا بیٹھا، اس کی زندگی کے منفی پیٹرن کی ایک مثبت علامت اور غیر یقینی صورتِ حال میں واحد یقینی شے بھی کھو گئی اور وہ دھند میں ہی رہا انھی دنوں جب دوبارہ اس کی ملاقات ڈاکٹر سہیل سے ہوئی تو وہ ایک نو دریافت کی خوشی میں سرشار تھے۔ دیوانے پن کی وجہ کے حوالے سے برسوں پہلے اٹھائے جانے والے اپنے سوال کا جواب وہ پا چکے تھے۔ انسانی تقدیر کو انسان کی حیاتیاتی وراثت قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر سہیل کا دعویٰ ہے کہ جینز کا تعلق محض جسم کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہر خلیے اور مرکزے اور کروموسومز کے ربن میں تقدیر مضمر ہے اور انھی جینز میں دیوانگی کا راز ہے جو تغیرِ نوع Gene Mutation سے تعلق رکھتا ہے:

"مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے، وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے۔ رزقِ حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزقِ حرام سے

جو genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ نسلِ انسانی سے یہ genes جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن ورثے میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزقِ حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔۔۔ کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے؟"(۵)

واقعہ یہ ہے کہ رضاے الٰہی کی خاطر احکامِ الٰہی بجالانے والے پر اسرارِ احکام کھلنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل کے فکر و تدبر کا حاصل یہ نظریہ دراصل قرآن کریم کی بیان کردہ حرام و حلال کی حدود سے تعلق رکھتا ہے اور اس ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ڈاکٹر سہیل کے مطابق رزق حرام کے منفی اثرات اگر کسی ایک نسل میں ظاہر نہ ہوں تو تیسری یا چوتھی نسل میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ حرام اور حلال رزق جسم کا بھی ہوتا ہے اور روح کا بھی، حرام و حلال سے پرے ایک رزق الوہی قسم کا بھی ہوتا ہے۔ جو شہیدوں کو عطا ہوتا ہے اور بنی اسرائیل کو بھی ملا تھا، اس رزق سے آگاہی اور عرفان جنم لیتا ہے جسے عام لوگ دیوانگی ہی قرار دیتے ہیں لیکن یہ جینز کے صالح تغیر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پرندوں کی اگلی میٹنگ میں بانو قدسیہ وجودِ انسانی کا المیہ سیمرغ کی زبانی نہایت اثر انگیز پیرائے میں بیان کرتی ہیں کہ وہ انسان جسے مطلوبِ کائنات بنایا گیا تھا اس نے خود کو طالب بنا کر خود دیوانے پن کی گردش کا انتخاب کیا اور اپنی حرص کے چکر میں وجودِ مطلق سے دور ہوتا چلا گیا۔۔۔ جب گدھ برادری کا وکیل گیدڑ تال میں اترا تو چیلوں کی ملکہ نے الزام اس کے گوش گزار کرتے ہوئے بتایا کہ انسان اپنی دیوانگی کے تحت اپنی ہی نسل کے برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔۔۔ اس حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا ویشھد اللہ علیٰ ما فی قلبہٖ وھو الد الخصام واذا تولیٰ سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لایحب الفساد۔"

اور لوگوں میں سے (کوئی ایسا بھی ہے) جو (کہ) بھلی لگتی ہے آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں اور وہ گواہ بناتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حال آں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب وہ (فضول باتیں کر کے) لوٹتا ہے (یا اسے حکومت ملتی ہے) کوشش کرتا ہے زمین میں تاکہ وہ فساد پھیلائے اس میں اور تباہ کرے کھیتی اور نسل (انسانی) کو اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"(۶)

چوں کہ فساد خالق کائنات کو ناپسند ہے، اسی وجہ سے پرندے بھی راجہ گدھ کو برادری سمیت جنگل بدر کرانے کے درپے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فساد کا باعث نہ ہو۔ کیوں کہ چیلوں کے بقول گدھ نے رزقِ حرام کا تصور انسان سے سیکھا ہے لہٰذا اس کی دیوانگی کے نتائج بھی لازمی طور پر وہی برآمد ہوں گے جو انسان کی دیوانگی کے ہیں۔

ناول دیوانے پن کی دو ممکنہ وجوہات ''عشقِ لاحاصل'' اور ''لامتناہی تجسس'' کے بعد اب ''رزق حرام'' میں پاگل پن کی جڑیں تلاش کر رہا ہے۔

عابدہ کے چلے جانے کے بعد قیوم کے لیے اپنی ذات کو کسی مرکز پر مجتمع کرنا نہایت مشکل تھا، ڈاکٹر سہیل نے بھی سمت کے تعین پر بہت زور دیا کیوں کہ سمت اگر کسی بڑے مشن کی ہے جو انسانیت کے لیے نافع ہے تو کارکن اللہ کا پیارا بن جاتا ہے اور اور اگر کوئی چھوٹا ذاتی مفاد کا مشن ہے تو اپنی ذات کو سکون حاصل ہوتا ہے، توجہ کا ارتکاز بہت ضروری ہے جیسا کہ انھوں نے اپنے ذہن کو نوکری کی ترقی پر مرکوز کیا ہوا تھا، قیوم کو بھی وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اور کچھ نہ سہی تو شادی کر کے ہی کسی مرکز سے جڑ جائے کیوں کہ مرکز سے جڑے رہنا نہایت ضروری امر ہے، اسی لیے تصوف میں تبتل الی اللہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مشورہ دے کر ڈاکٹر سہیل پر نم آنکھوں سے امریکہ روانہ ہوئے اور قیوم جو ریڈیو پروڈیوسر ہو چکا تھا اسے بچوں کی طرح معصوم ادھیڑ عمر طوائف امتل کا عارضی پڑاؤ ملا جو اسے وجودیاتی سطح پر اپنی گدھ برادری سے متعلق نظر آئی کیوں کہ ان دونوں کا رزق ان کی مردار خواہشیں تھیں اور ایسے انسانوں کی محبت ان کا مشترکہ ورثہ تھی جن کی روحیں کبھی ان کی تھیں ہی نہیں۔ امتل جو مزاروں پر دعائیں مانگتی تھی کہ اگر زندگی پیار کرنے والے کے سہارے کے بغیر گزری ہے تو کم از کم موت کسی پیارے کے ہاتھوں آئے بالآخر اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوتی ہے اور قیوم اپنی بھابھی سے شادی کے انتظام کے لیے کہتا ہے۔

اب ناول میں دیوانے پن کی جڑیں تلاش کرتا ہوا بیانیہ رات کے پچھلے پہر۔۔۔۔۔''موت کی آگاہی'' میں دیوانگی کی وجہ تلاش کرتا اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے، آخری اور فیصلہ کن کانفرنس میں پرندے بہت بڑی تعداد میں گدھ کے مقدمے کا انجام دیکھنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ کھٹ بڑھئی کثرت میں وحدت کی تلاش کو انسان کی دیوانگی کی وجہ بتاتا ہے، کوے کے مطابق انسانی وجود کی اکائی میں روح، سائیکی، سرشت، عقل اور قلب کے متنوع رنگ اس کی دیوانگی کا راز کھلنے نہیں دیتے، مینا کی رائے کے مطابق تمام عمر آرزوؤں کے جنگل سے گزرنے والا انسان تمنا کی قید کی وجہ سے ہی وحدت کو پا لینے سے قاصر رہتا ہے۔ سرکاری وکیل سرخاب گدھ سے اس کی دیوانگی کی وجہ دریافت کرتا ہے تو راجہ گدھ اسے اپنے دوست جوگی کا قصہ سناتا ہے جس نے تمام خواہشات سے آزاد ہونے کے بعد ابدیت کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے اور وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا۔ موت روزانہ اسے لینے آتی اور وہ اس کا مضحکہ اڑا کر اسے لوٹا دیتا اور پھر اشاروں کی زبان میں

گدھ کو بتاتا کہ موت اس کی روح نہیں لے جا سکتی لیکن ایک دن اس نے خود ہی پھندا لے کر اپنی جان موت کے حوالے کر دی۔ برگد سے لٹکے جوگی کے جسم کو گرہ سے آزاد کرنے کی کوشش میں پہلی بار آدم زاد کے لہو کی دھار گدھ کے حلق میں داخل ہوئی اور وہ موت سے ڈرا اور اس کے بعد اس کی سرشت میں میں تبدیلیاں آنے لگیں، وہ موت سے خائف ہو کر بھی موت کی تلاش میں رہنے لگا۔ ایک ناپائیدار، مختصر حیات کی بقا کی خواہش اس کے دیوانے پن کی وجہ ہے۔۔۔ اس پر گدھ کا وکیل گیدڑ منصف کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ موت کا احساس گدھ اور انسان کی سرشت کا حصہ ہے لیکن چیل ملکہ مصر ہے کہ موت کی آگہی اولاً گدھ کی سرشت میں نہ تھی۔۔۔ اس پر راجہ گدھ، چیل ملکہ کو پرامن کرتے ہوئے کسی فیصلے کا انتظار کیے بغیر ہجرت کا اعلان کرتا ہے اور یوں راجہ گدھ کی علامت مثبت رنگ اختیار کرتی ہے:

> "۔۔۔ ایک غلط فہمی میں مت رہنا۔ دیوانگی دو طور کی ہوتی ہے۔۔۔ ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات یہاں بیان کی گئیں ۔۔۔ جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارذل ترین مخلوق بن جاتا ہے لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی، تنکا اوپر اٹھتا ہے۔۔۔ پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔۔۔ دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے۔۔۔ حتّٰی کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے۔۔۔ عام لوگ اسے بھی پاگل پن سمجھتے ہیں۔۔۔ لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے۔۔۔ اس وقت وہ ایسے زہر آگیں بم بنا رہا ہے جس سے یہ کرہ زمین تباہ ہو سکتا ہے ۔۔۔ یہ اس کے دیوانے پن کی دلیل ہے۔۔۔ لیکن جب اس کرہ ارض کو بچانے کی ضرورت آئے گی، تب بھی ایک مقدس دیوانہ آئے گا۔ کاش ملکہ چیل کو میرے دیوانے پن پر اس قدر اعتراض نہ ہوتا تو ہم پرندوں کے لیے نئی سمتیں، نئے دروازے۔۔۔ نئی جہتیں کھول دیتے۔ ہمارا دیوانہ پن بھی عرفان کی ایک شکل ہے۔۔۔ (۷)

یوں اپنی برادری کے ساتھ عجز اور امن سے ہجرت کر جانے والے گدھ کی علامت کے تحت قیوم کا کردار بھی اثباتی حدوں میں داخل ہوتا ہے، جب اپنی منکوحہ روشن کے بارے میں اسے علم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے اپنا آپ کسی کو دان کر چکی ہے تو وہ ایک مثبت، مخلص اور ہمدرد انسان کی مانند کسی دوسرے شخص کی اس امانت کو سنبھال کر رکھتا اور پھر اس کے سپرد کر دیتا ہے، اسی دوران ڈاکٹر سہیل بھی اس کے سامنے ایک انکشاف اور اعتراف کرتے ہیں کہ سیمی اور آفتاب کی شدید محبت کے درمیان بدگمانی کی دھند ان کے حسد نے پھیلائی تھی۔۔۔ بعد میں جس شدید احساس جرم میں وہ مبتلا رہے اس نے ان کے سامنے بہت سے راستے کھولے اور وہ علم کے راستے پر تکبر کی بجائے عجز سے چلے۔

ڈاکٹر سہیل کا کردار ایک ایسے ولی کا کردار ہے جو کسی بھی مضطرب تعلیم یافتہ آدمی کا سینہ شق کر کے اپنی توجہ اس پر اثر انداز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، موت اور آزادی سے متعلق قیوم کے سوالوں کے جواب میں انھوں نے اسے تصورِ اسمِ ذات سے اگلی دنیا کا در کھولنے والے سائیں جی سے ملوایا اور خود امریکہ چلے گئے۔ کافی دن کی ریاضت کے بعد جس روز قیوم کو سیمی کی روح سے ملنا تھا اس سے ایک دن قبل وہ قبر اندر کی طرف دھنس چکی تھی جس میں بیٹھ کر سائیں جی اپنے روحانی معمول میں مشغول رہا کرتے تھے، قبر کے دھنسنے کا مطلب ان کا وصال تھا، جب روح کے معالج کو موت نے چھین لیا تو اسے پھر نفسیات دان سے رجوع کرنا پڑا۔۔۔ وہیں شہر کے معروف ماہر نفسیات کے کلینک سے باہر اس کی ملاقات عرصۂ دراز کے بعد آفتاب سے ہوئی جس کے ساتھ اس کا غیر معمولی بیٹا افراہیم تھا جس کی دیوانگی کے تقدس کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔۔۔ آفتاب کے بقول افراہیم خود کو دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا، کبھی وہ نہایت مہارت سے عربی بولتا اور کبھی عبرانی میں باتیں کرتا۔۔۔ مضطرب باپ آفتاب اس دیوانگی کی وجہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ اس کا ورثہ تھی یا یہ آفتاب کے عشق لاحاصل کا نتیجہ تھی؟ افراہیم کی کوئی ایسی جستجو بھی نہ تھی جو اس کی دیوانگی کا باعث ہوتی اور نہ ہی موت کی آگہی اس چھوٹی سی عمر میں اس دیوانگی کا سبب تھی۔۔۔ اس پر قیوم نے جو اس سارے دائرے میں گھوم چکا تھا آفتاب کو یقین دلایا کہ اس کے بیٹے کا دیوانہ پن ننگِ انسانیت نہیں بلکہ نہایت مقدس ہے۔ حقیقتاً کبھی بھی مدینہ دیکھے بغیر اسے مدینے کی سڑکوں پر مختلف اقوام کے لوگ دوڑتے اور اذانیں دیتے نظر آتے ہیں جو بین الاقوامی انقلاب کی علامت ہے ۔۔۔ عشق کے تقدس کی یہ علامت افراہیم، قیوم کے لیے نہایت محترم تھا:

> ”افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سر بسجود تھا، میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر محجوب کھڑا تھا اور ہم دونوں کے درمیان انسان کے ارتقاء کا مسئلہ کھنچی کمان کی مانند تنا ہوا تھا۔ انسان کو ایب نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟“ (۸)

وجودِ انسانی کے ترفع اور پستی سے متعلق بنیادی سوالات اٹھا کر ان کے مقدور بھر جوابات دیتا بانو قدسیہ کا یہ ناول بلاشبہ ایک منفرد تجربہ ہے جس میں فکر و فلسفہ بھی ہے، لوک دانش اور علامتیت بھی اور تصوف بھی۔۔۔ حلال و حرام کے شرعی تصور کے انفرادی اور اجتماعی وجود پر اثرات کا بلیغ تجزیہ بلاشبہ اس ناول کی وسعت اور وحدت کو اعتبار عطا کرتا ہے، گدھ کی علامت کی دوہری سطح باقی تمام فکری و فنی خوبیوں کے ساتھ مل کر اسے اردو کے اہم اور نمایاں ناولوں کی صفِ اول میں جگہ دیتی ہے۔

تاحال بانو قدسیہ کا آخری ناول ”حاصل گھاٹ“ ایک بوڑھے شخص کی کہانی اسی کی زبانی ہے جو امریکہ میں اپنی بیٹی کے گھر کی بالکونی میں بیٹھ کر حسابِ عمر کے گوشوارے کی پڑتال کرتے ہوئے وجود کے خارجی اور داخلی ارتقاء کو ”ترقی“ اور

"فلاح" کا عنوان دیتا ہے۔ ان بنیادی موضوعات کے تحت ہمایوں فرید وجودیات کے مباحث ۔۔۔ خوبی، تعلق، ارتقاء اور تصوف کی مختلف اصطلاحات کے تناظر میں اپنے حاصلِ زندگی کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور بالآخر لسانی اقرار اور قلبی تصدیق کے سامانِ وجود کے ساتھ فلاح والوں کے رستے کا انتخاب کر کے لذتِ آشنائی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ انسانی ذہن کے تضادی وصف یعنی خیال سے حقیقت اور حقیقت سے خیال تک کے سفر میں ناول کی بنت کا راز مضمر ہے۔ افراد اور اقوام کے وجود پر رواں تبصرہ اس بنت میں خاص رنگ بھرتا ہے ۔۔۔ یوں ناول کا بیانیہ فرد سے اجتماع اور اجتماع سے فرد تک سفر کرتے ہوئے ماضی و حال سے حکمت کے موتی چنتا آگے بڑھتا ہے۔ فلسفہء تقدیر پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھاتا ہے کہ بعض کو بعض پر سبقت کس بنا پر حاصل ہوتی ہے اور مشرق و مغرب کے مختلف دائروں کا تجزیہ بھی کرتا ہے کہ مغرب کس طرح خواہشات کی پیروی اور مادی ترقی کی دوڑ کے سبب وجود کی بے معنویت اور زندگی کے بے کیفی کا شکار ہوا ہے اور مشرق کسی طرح مادی ترقی کے برعکس فلاح کا نسخہ تجویز کرتا ہے جو فی الدنیا حسنۃ وفی لآخرۃ حسنۃ کی صدائے جانفزا لگاتا ہے۔ قوموں کے اجتماعی وجود کا تجزیہ کرتے کرتے ہمایوں فرید اپنے انفرادی وجود کی داستان بھی سناتے ہیں۔ اپنی آپیا کی دوست اقبال سے ان کی محبت تمام عمر "گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات" کے مصداق رہی۔ دراصل وجود کی علویت میں تعلق کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ جسے بانو قدسیہ حسیات سے متعلق غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت قرار دیتی ہیں جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن دوسرے پر واضح کرنا نہایت دشوار ہے:

> "جس طرح اللہ کی بنیادی ننانوے صفات کو جان کر بھی اللہ کا ادراک ناممکن ہے، کلی طور پر اس ذاتِ باری تعالیٰ کی ہمیں سمجھ آجائے، یہ خیالِ خام ہے ایسے ہی اقبال سے تعلق کو میں سمجھ نہ پایا تھا۔ وہاں سب کچھ تھا اور کچھ بھی Tangible نہ تھا ۔۔۔۔۔ بندے کی دوئی کو کیا کیجیے، اس کی خوبی ہی اس کی خرابی اور اس کی خرابی ہی اس کی خوبی ہے۔ اس کے قلب میں سدا بہار حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے اور وہ من و تو کے جھگڑوں سے نکل نہیں سکتا ۔۔۔"(۹)

دوئیت کا مبحث از منہِ قدیم سے انسان کو درپیش رہا ہے اور دورِ جدید کا انسان ترقی کے منتہائے کمال پر پہنچ کر خاص طور پر دوئی کے اس کرب سے دوچار ہے، جسم اور مادے پر اپنی تمام تر صلاحتوں کو صرف کر کے وہ روح کی تہی دامنی پر شرمندہ بھی ہے اور حیران بھی۔ "راجہ گدھ" میں بھی اس دوئیت میں انسان کی دیوانگی کی وجہ تلاش کی گئی ہے۔ دوئیت کا یہ مبحث ہمایوں فرید کو اپنی بیوی اصغری اور اقبال کی مناسبت سے یاد آیا ہے کیوں کہ اصغری تعلق کی عملی شکل تھی اور اقبال خیالی چادر ۔۔۔ محبت اور آزادی کا تضاد، ترقی اور فلاح کا فرق ۔۔۔ ثنویت کی مختلف شکلیں ہیں۔ ترقی میں خواہشات کا پھیلاؤ انسان کو نہ جینے اور نہ مرنے دیتا ہے جب کہ فلاح میں پہلا قدم ہی نفس کی قربانی سے اٹھتا ہے۔ یہاں خواہش کی پنیری کو

ریاضت، مجاہدے اور صبر کی مدد سے نکال کے پھینک دیا جاتا ہے اور راضی برضا کے نسخے کو وظیفہء حیات بنایا جاتا ہے۔۔۔ یہاں بانو قدسیہ مہاتما بدھ کو پہلا وجودی قرار دیتی ہیں جس نے اپنی آزادی کو اس حد تک قائم کر لیا تھا کہ انسان تو دور کی بات اس نے خدا کو بھی مدد کے لیے نہیں پکارا۔۔۔ خیالات کا دھارا ہمایوں فرید کو فلاح کے رستے پر مرشد، گرو، استاد اور نبی کی رہنمائی کی طرف لے جاتا ہے تو اسے اپنا بیٹا جہانگیر یاد آتا ہے جو ترقی کے راستے کا انتخاب کرنے کے بعد امریکہ کی تنہائی میں اپنی مشرقی جڑوں کو بھول نہیں پاتا اور راہ نما باپ کو ساتھ لے جانے کے لیے آپہنچتا تو ایک نصیحت بھرا انکار اس کا منتظر ہوتا ہے:

"۔۔۔ ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہو سکتی۔۔۔ گھبراؤ نہیں واپس لوٹ جاؤ۔۔۔ نروان حاصل کرنے کے لیے کپل وستو چھوڑنا پڑتا ہے شاکیا منی۔۔۔ ہجرت بنیادی اصول ہے آگاہی کے لیے۔۔۔" (۱۰)

یہاں ہمایوں فرید کے طرزِ فکر کا تضاد بھی آشکار ہوتا ہے جب ایک طرف تو وہ اپنے بیٹے کو نروان حاصل کرنے کے لیے شاکیا منی کی مثال دیتے ہیں جس نے اپنی آزادی کو نہایت درجہ قائم کر لیا تھا تو دوسری طرف محبت اور آزادی کا تجزیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال کی روشنی میں کرتے ہوئے اُن کے ہر حال میں راضی برضا رہنے کو محبت کی عظیم مثال قرار دیتے ہیں اور محبت میں ذاتی آزادی طلب کرنے کو شرک گردانتے ہیں کیوں کہ بیک وقت اپنی اور محبوب کی ذات سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح وجود ایک وحدت ہے، محبت بھی عملِ وحدت ہے، سچی طلب اپنا راستہ اور اپنی منزل خود تلاش کرتی ہے اور سچا طالب کبھی بھی خالی ہاتھ لوٹایا نہیں جاتا۔۔۔ وہ دولتِ دو جہاں کا حق دار ٹھہرتا ہے:

"فلاح کی راہ پہ چلنے والے غم سے نپٹنے کے لیے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ جہاد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹوٹنا استعمال میں نہیں لاتے۔ صبر کا دارو پینے والے شرم و حیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کوئلوں کو دم پخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں غم کی بوٹی گھاس سے چننے کا رواج نہیں بلکہ آکسیجن دیئے بغیر غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔" (۱۱)

صبر کے ساتھ راہِ سلوک کے مسافر شکر کی منزل کو بھی مد نظر رکھتے ہیں، ہمایوں فرید کو راستے میں ملنے والا نوجوان جس کا نام احمد ہے اور جو خود کو مسٹر جنک کہلوانا پسند کرتا ہے، وہ ڈپریشن کو ناشکر گزاری کی قلبی بیماری قرار دیتے ہوئے اپنے سمیت ان تمام لوگوں پر تنقید کرتا ہے جو غم کے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے شکر گزار ہونے کی بجائے اس کی رکاب میں پاؤں پھنسا کر گھسٹتے چلے جاتے ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس کر کے شیطان انھیں حدیثِ نفس کا شکار کرتا ہے اور

پھر وہ تلاوت الوجود کے عادی ہو کر نہایت منفی سوچ کے حامل ہو جاتے ہیں اور ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جن کے تحت وجود یوں نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔ ہمایوں فرید مسٹر جنک اور عبد گل نامی نوجوانوں کو فلاح والوں کا علاج تجویز کرتا ہے کہ وہ اللہ کے ذکر میں پناہ ڈھونڈیں کہ اس کے بغیر اطمینانِ قلب ممکن نہیں۔ اپنی زندگی کے واقعات پر غور کرتے ہوئے ہمایوں فرید گھوم پھر کے اقبال کے سوال پر پھر الجھ جاتا ہے اور اسی الجھن کے دوران ایک دن اسے نیویارک کے اردو مرکز کی طرف سے پیغام موصول ہوتا ہے کہ اس کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کرایا گیا ہے۔۔۔ یہ بات اس کے لیے باعثِ حیرت ہے کیوں کہ جوانی میں وہ جو تک بندی کرتا تھا اسے شاعری تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اردو مرکز جانے پر عقدہ کھلتا ہے کہ یہ مشاعرہ اقبال کے شوہر نے منعقد کرایا ہے جو ایک سابق بیوروکریٹ، شاعر اور خوبصورت شخصیت کا حامل انسان ہے۔ ہمایوں فرید کا نام اقبال نے تجویز کیا تھا۔۔۔ اقبال سے اس کی ملاقات گویا اس کی الجھن کا اختتام ثابت ہوتی ہے۔ زندگی میں سب کچھ حاصل کر لینے والی اقبال جب اقرار کرتی ہے کہ اس کے وجود میں کوئی ایسا خلارہ گیا کہ جسے ''سب کچھ'' بھی پر نہ کر سکا اور یہی اعتراف ہمایوں کی لگن کا حاصل تھا اور یہی لگن اس کی آزمایش بھی بنتی ہے، جب اقبال اس سے امریکہ چھوڑ دینے کا مطالبہ کرتی ہے جو کہ ایک مشکل فرمایش ہے کیوں کہ یہاں وہ اپنی بیٹی اور نواسوں میں مگن ہے لیکن وطن میں صرف بڑھاپا اور تنہائی اس کی منتظر ہے۔ دوسری طرف اقبال کا امریکہ میں قیام اس لیے ناگزیر ہے کہ اس کی ابنارمل بیٹی کا علاج یہاں سے ہو رہا ہے لیکن وہ ہمایوں کی موجودگی کے احساس کے ساتھ مکاں کے اس حصے میں نہیں رہ سکتی۔ اقبال جسے بیٹی کے غم نے موت سے بہت پہلے مار ڈالا ہے وہ ایسے شخص سے قربانی کی متمنی ہے جس کے ساتھ اس کا کوئی زمینی رشتہ نہیں اور وہ شخص بھی اس کی خاطر اپنی من چاہی جنت سے رخصت ہو گیا کیوں کہ اس نے حسابِ عمر کے گوشوارے کی پڑتال کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا:

> ''۔۔۔ وہ منتظرِ کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں، نہ تاویلوں میں۔ جنھیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ حکم ماننے کے لیے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے۔ نہ جنت کی خواہش، نہ دوزخ کا عذاب۔۔۔۔۔۔ ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔''(۱۲)

ماننے کی عظمت سے آشنا ہو کر ہمایوں فرید خارجی اور داخلی وجود کی ہم آہنگی کے ساتھ فلاح کے پھاٹک سے ابدی کامیابی کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے فلسفۂ ہجرت کی خوبصورتی کا راز بھی افشا کرتے ہیں کہ ہجرت کا تعلق مہاجر کے ظرف سے ہے، اولاً انھوں نے اپنی بیٹی کی محبت اور اپنی تنہائی کے خوف سے ترکِ وطن کیا اور ثانیاً کسی دوسرے انسان کی محبت اور خواہش کے احترام میں اپنی من چاہی جنت کو چھوڑا جہاں بیٹی اور نواسوں کی محبت، سہولت اور آسانی تھی۔۔۔ اس ناول کا انتساب بھی ہجرت کرنے والوں کے نام ہے اور ہجرت کے فلسفے کی بنیاد ہی ایثار ہے۔ راجہ گدھ بھی اپنے ساتھی پرندوں کی

خاطر کوئی فساد اور نقضِ امن کیے بغیر اپنے برادری سمیت اپنے جنگل سے رخصت ہوا۔ یوں ہجرت بانو قدسیہ کے ناولوں کے وجودیاتی عناصر میں ایک اہم عنصر ہے۔۔۔ یہاں ظاہر سے باطن کی طرف ہجرت، من چاہے سے ان چاہے کی طرف ہجرت، اللہ کی زمین میں اللہ کے فضل کی تلاش میں ہجرت۔۔۔ قابلِ لحاظ اہمیت کی حامل ہے اور انفرادی انسانی وجود سے لے کر اجتماعی قومی وجود تک کی فلاح کی ضامن بھی ہے۔۔۔!

اشفاق احمد کی ہشت پہلو ادبی شخصیت نے افسانہ نگاری اور ڈرامانویسی میں تو کمالِ فکر و فن کے جوہر دکھائے ہی ہیں لیکن اردو ناول کے وجودیاتی عناصر کے مطالعے میں ہم ان کے واحد ناول ''کھیل تماشا'' کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو ان کے کلارنٹ ماسٹر اقبال حسین کے ماسٹر بھائی اقبال سنگھ بننے سے لے کر باجے والا جوگی بننے تک اور پھر شہادت پانے تک کے مراحل طے کرتا ہے اور ساتھ ہی رجنی کے عشق کی داستان بھی سناتا ہے اور ضمنی قصے کے طور پر بابا سنگل شاہ کے وجودیاتی سفر کا بھی احاطہ کرتا ہے، جو تقدیر کی جبریت کا شکار ہو۔۔۔ ناول کا مرکزی خیال ''وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور'' کے گرد گھومتا ہے۔

ماسٹر بالی کا کردار بھی اشفاق احمد کے شاہکار افسانے ''گڈریا'' کے داؤ جی کی طرح تصوف و حکمت کا مخزن ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ داؤ جی ہندو تھے اور اپنے مسلم مرشد کی ذات اور یاد کے حصار سے باہر نہیں آتے تھے، دیوانوں کی طرح سر پٹکتے ہوئے اونچی آواز میں اپنا محبوب شعر گایا کرتے تھے:

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی![۱۳]

ماسٹر اقبال حسین مسلمان سے سکھ ہوئے تھے لیکن ان کے مزاج کا دھیما پن عجز اور حسنِ اخلاق آغاز تا انجام نا آشنائے تغیر رہا، تبدیلیِ مذہب انھوں نے سکھوں کے مجبور کرنے پر کی تھی کہ وہ تقسیم کے بعد اپنے مرے ہوئے باپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، سکھ اکثریت کے اس علاقے میں رہنے کے لیے مجبور کیا گیا کہ وہ سکھ ہو جائیں یا علاقہ چھوڑ دیں۔ ہند اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر وحدتِ ادیان کا تصور رکھنے والے ماسٹر بالی کے لیے سکھ مذہب کو قبول کرنا آسان تھا کیوں کہ وہ اس سے قبل بھی نمازِ فجر سے پہلے گوردوارہ کے کلس کی طرف منہ کر کے کلارنٹ پر آسا کی وار بجاتے تو سکھ بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، ''کھیل تماشا'' میں کلارنٹ کو استاد بالی کے مرشد کا سا درجہ حاصل ہے۔ ان کی انسان دوستی کا بھرپور تاثر ناول کے آغاز ہی میں قائم ہو جاتا ہے جب وہ قرآنِ پاک چوری کر کے بھاگتے ہوئے پکڑے جانے والے پٹتے ہوئے نوجوان کو لوگوں کی مار سے بچا کر قرآنِ پاک کا ہدیہ خود ادا کرتے ہیں اور اس کے حوالے سے اشفاق صاحب سے کہتے ہیں:

"صاحبزادے! ہم سبھی چور ہیں، کوئی مول کا چور کوئی بیاج کا چور، کوئی چور کا چور کوئی یار کا چور! یہ سارا بادھا پسارا چوری یاری کا ہی ہے۔ وہ چور نہیں تھا یار تھا۔"(۱۴)

قیامِ پاکستان کے بعد یہ نوجوان اشفاق صاحب کو واپڈا کے اہم آفیسر کے طور پر ملتا ہے، اس ناول کا واحد اہم نسوانی کردار رجنی کا ہے جو ماسٹر بالی کے بقول شکتی کا روپ ہے، ان کے عشق میں گرفتار یہ برہمن لڑکی اس قدر بے اختیار ہوئی کہ اس کے شوہر کو روتے دھوتے ماسٹر صاحب کے دوارے آنا پڑا کہ وہ ان کی بیوی سے مل لیں، اس کے سینے سے نادِ علی کی آواز آتی ہے، ماسٹر اقبال حسین کے عشق میں اس برہمن لڑکی کا مسلمان ہو جانا اور ماسٹر اقبال کا اپنے مرے ہوئے باپ کی تنہائی کے خیال سے استاد بھائی بابلی سنگھ بننا قبول کرنا وجود کے حیرت کدے کی انوکھی شانیں ہیں۔ پھر ماسٹر بالی کی محبت میں گرفتار اشفاق صاحب کا اپنا کردار ہے لیکن ان کا ماسٹر صاحب سے عشق بڑا حقیقی اور انوکھی قسم کا ہے جس میں ضد، لاڈ اور تعصب سب چلتا ہے، وہ ان سے کلارنٹ سیکھنے کے لیے گئے لیکن رجنی کے قصے کے تعصب کی وجہ سے اپنے دروس ادھورے چھوڑ آئے۔ ان کے مطابق:

"بین، پونگی، بانسری، کلارنٹ جہاں بھی بجتی ہے وہاں کچھ نمودار ضرور ہوتا ہے۔ ارد گرد کچھ بھی نہ ہو۔۔۔۔۔۔ نہ ویرانہ ہو نہ سنسان، نہ زمان ہو نہ مکان، نہ ہونا اور نہ ہو سکنا تو اس کے درمیان ہویدا ہو جاتا ہے۔ اصل میں تو کوئی درمیان بھی نہیں ہوتا بس ہستی ہی بل کھا کر ہویدا بن جاتی ہے۔ لوگ ہر بل کھانے والی چیز کو سانپ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ سانپ نہیں ہوتا۔ بین کی آواز پر ہویدا ہوتا ہے، لوگ ہویدا کو سانپ کہنے لگ جاتے ہیں۔!"(۱۵)

تقسیم کے وقت استاد بالی کا کہنا تھا کہ یہ بابے بڑے طرفدار ہوتے ہیں، نہ داتاؒ اپنے پیارے اجمیریؒ سے الگ رہ سکتے ہیں اور نہ بابا فریدؒ اور نظام الدینؒ، دربار صاحب امرتسر ہو اور اس کی بنیاد رکھنے والے میاں میرؒ لاہور میں۔۔۔ یہ سب ہمیشہ نہیں چل سکے گا۔ ضمنی قصے کے طور پر بابا سنگل شاہ کی کہانی بھی آتی ہے جو اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کی وجہ سے اپنے بھائی سے بد دل ہو کر اور سب رشتوں سے منہ موڑ کر ایک ہی رشتے کو اپنانے نکلا۔ ملامتی بنا، سدا سہاگن بنا، خود کو زنجیروں میں قید کیا، لیکن عورت کا لوبھ اور لالچ دل سے نہ نکال سکا اور پھر ایک عورت ہی کی خاطر زنجیریں چھوڑ کر گجرات کر کچہری کا وثیقہ نویس بنا اور پھر حادثاتی طور پر اچانک ایک بڑی رقم اس کے ہاتھ لگی۔ ایکسپورٹ کا تاجر بن کر جرمنی اور ہالینڈ روہ بھیجنے لگا اور اپنے کاروبار کو وسعت دینے کی خاطر محوِ سفر تھا کہ تباہ حال جلتی ہوئی گاڑی میں چیخیں مارتی ہوئی زندگیوں کو بچانے کے لیے آگ میں کود گیا اور پھر جان ہار گیا۔۔۔ اس سے بھی زندگی کی حقیقت واضح کرنا مقصود ہے جسے ماسٹر صاحب کھیل تماشا کہتے تھے:

"ماسٹر صاحب زندگی کی ساری احتیاطی تدابیر کو اور جہدِ مسلسل کو کھیل تماشے کا نام دیتے تھے۔ ان کو نہ کھیل سے دلچسپی تھی نہ تماشے سے۔ دیکھنے سے نہ اپنا آپ دکھانے سے۔ نہ روٹھنے سے نہ نچ کے یار منانے سے۔ پھر بھی وہ کھیل تماشے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے لیے بارات کی آمد اور جنازے کی روانگی ایک سے تقدس کے حامل تھے۔۔۔۔۔۔ (۱۶)

اشفاق صاحب کی زندگی میں استاد بالی کے راہنما کردار کا بڑا ہاتھ تھا، اس لیے وہ انھیں "میرے صاحب"، "میرے مرشد" کے نام سے یاد کرتے ہیں، جب روحانی دنیا کی کھوج میں وہ ابلیسی طاقتوں کے ہتھے چڑھے تو ان کے بچ جانے اور اس غلاظت سے باہر آنے میں استاد بالی کی روحانی طاقت اور فیض کار فرما تھا، بابلی گرنتھی کے طور پر سکھ برادری میں بھی ان کا خوب چرچا تھا اور لوگ ان کا پاٹھ سننے دور دور سے آیا کرتے، ناول کے اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے ان کی تبدیلیِ مذہب کی حقیقت بھی کھلتی ہے جب وہ کیمرے کی تلاش میں اشفاق صاحب کے ساتھ حسن ابدال جاتے ہیں اور وہاں چند افغان مجاہدوں سے ملتے ہیں اور اشفاق صاحب کو وہاں سے روانہ کر کے خاموشی کے ساتھ افغانستان روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں ظلم کی تلخی میں رچے وجودوں کو باجے والا جوگی بن کے اپنی کلارنٹ کی دھن سے شادمان کرتے اور بالآخر دو بچوں کو روسی سپاہیوں کی زد سے بچاتے ہوئے ان ظالموں کو جہنم واصل کر کے خود منصبِ شہادت پاتے ہیں۔۔۔ مجاہد کے بقول ہوائی حملوں کے دوران بھی وہ اپنی کلارنٹ بجاتے رہتے اور اس نے اس دوران کئی جہازوں کو شرمندگی سے واپس لوٹتے دیکھا تھا، شہادت کے بعد انھیں اسی حال میں دفن کر دیا گیا کیوں کہ وہاں سکھوں کی رسم کے مطابق جلانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یوں اشفاق صاحب نے بظاہر ایک باجہ بجانے والے کو اپنے لفظوں اور کہانی میں امر کر دیا ہے۔ وہ عام طور پر جن کرداروں کے روحانی ترفع کی داستان رقم کرتے ہیں وہ معاشرے کی نظر میں ناقابلِ التفات ہوتے ہیں، اس حوالے سے ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں:

"لکھ پڑھ کر اور ادیب و دانشور بن کر عام قاعدے کے مطابق ان کا رشتہ و رابطہ اپنے دیہاتی اور گنوار عوام سے منقطع نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس وہ ساری زندگی انھی کے احساسات و مشاہدات کی ترجمانی کرتے رہے بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ وہ ناخواندہ، اجڈ، اور ناقابلِ التفات طبقے کو گلیمرائز کرتے رہے اور اپنے سننے والوں کو مجبور کرتے رہے کہ وہ اس طبقے کو تعظیم دیں، ایسی انوکھی بات کسی اور دانش ور میں دیکھنے میں نہ آئی اس لحاظ سے وہ بڑے منفرد تھے۔" (۱۷)

بینڈ کے ساتھ اپنی انفرادی حیثیت میں کلارنٹ بجانے والے استاد بالی جو روحانی طور پر مالامال تھے۔۔۔بظاہر ایک عام انسان تھے لیکن جوانی ہی سے دنیائے دوں کی حقیقت ان پر منکشف تھی، اپنی عجز بھری جوانی اور روحانی نور سے روشن ادھیڑ عمری میں کھیل تماشے سے خاموشی سے گزرتے ہوئے دوسروں کو بھی خاموشی سے گزرنے کی خاموش تلقین کرتے رہے۔یوں اشفاق احمد نے اپنے مخصوص انداز میں تقدیر اور فنا کے وجودیاتی مبحث کو تصوف اور لوک دانش کی ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اسلوب کی حلاوت میں ڈھال کر نہایت پر تاثیر بنادیا ہے اور اس ناول سے ان کی شاہکار افسانے ''گڈریا'' کی خوشبو آتی ہے۔۔۔۔۔!

حواشی

۱۔بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۱۴

۲۔راجہ گدھ، ۱۴۰

۳۔ایضاً، ص ۱۹۰۔۱۹۱

۴۔ایضاً، ص ۲۰۲

۵۔ایضاً، ص ۲۷۶

۶۔سورۃ البقرہ، آیت ۲۰۴۔۲۰۵

۷۔راجہ گدھ، ص ۳۸۳

۸۔ایضاً، ص ۴۵۲

۹۔بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۷۷

۱۰۔ایضاً، ص ۱۶۱

۱۱۔ایضاً، ص ۲۳۹

۱۲۔ایضاً، ص ۳۳۴

۱۳۔اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۹

۱۴۔اشفاق احمد، کھیل تماشا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۔۴۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۷۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد حیات سے موت تک'' لاہور: نوائے وقت (روزنامہ) ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۴ء